# عربی سوانحی ادب اور
# سبحۃُ المرجان

محمد ساجد حسین

بر صغیر پاک و ہند ہمیشہ سے علوم و فنون کا گہوارا رہا ہے۔ یہاں چند گھرانے ایسے ضرور رہے ہیں جنہوں نے تشنگان علوم کو بہرہ مند کیا اور اکثر نامور ہستیوں کے مادر علمی رہے۔

دارالسلطنت دہلی میں مرکزیت کی وجہ سے ہمیشہ علماء و فضلا کا اجتماع رہتا تھا، چنانچہ شیخ حمید الدین، سلطان المشائخ نظام الدین، شاہ ولی اللہ، شیخ عبدالحق جیسے علماء وہ ہیں جنہیں دنیائے علم و دانش اپنا سر تاج خیال کرتی ہے۔ بلبن کے عہد 1266ء جس کو فرشتہ نے خیر العصر قرار دیا ہے۔(۱) دہلی خاص طور پر اہم علمی مرکز اور علماء کا مرجع بن گئی یہ وہ زمانہ تھا جب منگول وسط ایشیا اور دوسرے ممالک میں ثقافت کے مراکز کو تباہ کر رہے تھے اور ہر طرف سے علماء و دانش ور دہلی میں پناہ لے رہے تھے۔ لیکن 1399ء میں تیموری حملے کے بعد دہلی کا شیرازہ بکھر گیا(۲) اور اہل علم و فضل ملک کے اطراف و جوانب میں پھیل گئے۔ ان ایام میں جو ہستیاں دہلی کو چھوڑ کر پورب(۳) کی طرف مائل ہوئیں ان میں قاضی شہاب الدین، قاضی عبدالمقتدر(۴) کے پوتے شیخ ابو الفتح ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

انہی قصبوں میں بوڑھی گنگا کے کنارے ایک ٹیلے پر واقع بلگرام(۵) کا قصبہ بھی ہے۔ جس کو سادات بلگرام کی دینی اور دنیوی وجاہت کے باعث مسلمانوں میں بلند مقام حاصل ہو گیا اور جلد ہی یہ علماء کا مرجع بن گیا۔ بادشاہ عالمگیر بنفس نفیس بلگرام گیا تو اس قصبہ کا ستارہ اوج کمال پر پہنچ گیا۔

حسان الہند غلام علی آزاد مولفِ سبحۃ المرجان اسی قصبہ میں پیدا ہوئے۔ اپنی تصنیف سبحۃ المرجان میں اپنی سوانح حیات خود تحریر کرتے ہیں۔(۶)

تاریخ پیدائش کے بارے میں لکھتے ہیں کہ میری پیدائش قصبہ بلگرام کے محلّہ سیداں پور میں بتاریخ ۲۵ صفر، ۱۱۱۶ھ رجون، ۱۷۰۴ء کو ہوئی۔

اپنے اساتذہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ میرے پانچ استاد ہیں۔

۱۔ میر محمد طفیل: علوم درسی کا سرمایہ میں نے ان سے حاصل کیا۔

۲۔ میر عبدالجلیل: نعت، حدیث، سیرت نبوی اور فنون ادب میں یہ میرے استاد تھے۔

۳۔ سید محمد میر: خلف الصدق میر عبد الجلیل۔ عروض و قوافی اور بعض فنون و ادب ان سے سیکھے۔

۴۔ شیخ محمد حیات: مدینہ منورہ میں ان سے صحیح بخاری اور صحاح ستہ کی اجازت حاصل کی۔

۵۔ شیخ عبد الوہاب طنطاوی: مکہ معظمہ میں ان سے بعض فوائد حدیث سنے۔ شیخ نے آپ کے شعر سن کر آپ کو "حسان الہند" کا خطاب عطا فرمایا۔

لکھتے ہیں کہ میں نے اپنی عمر میں تین اہم سفر کیے۔

۱۔ ۱۱۳۴ء میں میر عظمت اللہ بیخبر کے ہمراہ بلگرام سے دہلی تک وہاں دو سال قیام کیا۔

۲۔ بلگرام سے سیوستان تک (یہ سندھ کا ایک قصبہ ہے (۷) یہاں میرے ماموں سید محمد میر وقائع نگار اور میر بخشی تھے (ذوالحجہ ۱۱۴۲ھ کو روانہ ہوا اور ۱۰ ربیع الاول کو واپس آیا)

۳۔ تیسرا سفر بغرض حج کیا، رجب ۱۱۵۰ھ کو روانہ ہوا اور ۱۱۵۲ھ میں واپس آیا۔

(واپسی پر اورنگ آباد میں نومبر ۱۷۳۷ء میں مستقل سکونت اختیار کی اور باقی عمر کے ۴۸ سال یہاں گزارے (۸)

سوانحی ادب کی تاریخ بڑی قدیم ہے۔ انسانی معاشرت میں اس کی اہمیت اس قدر زیادہ ہے کہ دنیا کی کوئی زبان بھی ایسی نہیں جس میں اس فن کا سراغ نہ ملتا ہو۔ قومیں اپنے آباء و اجداد کے کارناموں سے ہی اپنی تاریخ مرتب کرتی ہیں اور ان کے نقش قدم سے ہی انہیں منزل کا سراغ ملتا ہے۔

داعیان حق اور مصلحین کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ جب بھی انہوں نے قوم کو اسلاف

کے کارنامے بھلا کر نئی راہ پر ڈالنے کی کوشش کی قوم نے نہ صرف یہ کہ اس سے انکار کر دیا بلکہ ان کی شدید مخالفت کی۔

عربوں کے ہاں تو قبائلی عصبیت کا جذبہ بڑا شدید تھا وہ تو اپنے سرداروں کے قول کی حفاظت کے لیے جان کی بازی لگا دیتے تھے اپنے قبیلہ کی تاریخ کو شعروں میں نظم کر لیتے اور پھر سوق عکاظ (۹) اور دیگر جہاں بھی موقعہ ہوتا انہیں فخریہ انداز میں دہراتے۔ چنانچہ اس دور کی تاریخ انہی اشعار کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہے۔ الشعر دیوان العرب، جاہلیت کا ممتاز شاعر زہیر بن ابی سلمٰی پہلے تو ان مقامات کی نشاندہی کرتا ہے جہاں کسی زمانے میں اس کا قبیلہ رہائش پذیر تھا اور پھر اپنے دو سرداروں کے اس عظیم کارنامے کو بیان کرتا ہے کہ عبس اور ذبیان کے درمیان ایک معمولی سی بات پر لڑائی چھڑ گئی تھی جو پچاس سال تک مسلسل جاری رہی اور جس میں طرفین کے سینکڑوں آدمی قتل ہوئے۔ ان دو سرداروں نے اپنے پاس سے مال خرچ کر کے ان دونوں قبیلوں کے درمیان صلح کر دی۔ (۱۰)

أمن ام اوفی دمنة لم تکلم    بحومانةالدراج[۱۱] فالمتثلم (۱۲)

ان کے اس عظیم کارنامے کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے :

تدار کتما عبساً و ذبیان ، بعد ما    تفانوا دقوا بینهم عطر منثم (۱۳)

لیکن اس دور میں عربوں کے ہاں سوانح نگاری کا کوئی تصور موجود نہیں تھا وہ تو ان واقعات کو فخر و حماسہ کی خاطر دہراتے تھا لیکن ان واقعات کی تاریخی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور علماء نے سوانح نگاری کو تاریخ کی ہی ایک قسم قرار دیا ہے۔ سید عبداللہ مرحوم لکھتے ہیں :

"سوانح نگاری عربوں میں قدیم سے رائج تھی (۱۴)"۔ لیکن حقیقی سوانح ادب کا شعور عربوں میں اس وقت پیدا ہوا جب جرح و تعدیل کے لیے علماء نے کتابیں مرتب کیں جو فن سوانح نگاری کے لیے ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں چنانچہ مسلمانوں نے تحقیق حدیث کے لیے اسماء الرجال کا جو فن ایجاد کیا اس کے بارے میں اسپرنگر کہتا ہے :

"کوئی قوم دنیا میں ایسی گزری نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال کا سا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے"۔ (۱۵)

اس کے بعد مسلمانوں نے اس فن کی طرف توجہ کی اور جلد ہی نمایاں شخصیات مستقل تصانیف کا موضوع بن گئیں۔

اٹھارویں صدی میں سوانح نگاری کو بجائے خود ایک مستقل فن کی حیثیت حاصل ہو گئی اور عربی زبان میں کئی عظیم تصانیف معرض وجود میں آئیں۔ چنانچہ طبقات ابن سعد، فتوح البلدان، طبری، اسد الغابہ خاص شہرت رکھتی ہیں۔ مسلمان سوانح نگار نے چونکہ ایک عظیم مقصد کے پیش نظر اس فن کی بنیاد رکھی تھی اس لیے وہ شخصیات کے حالات لکھنے کے ساتھ ساتھ ان کی نفسیات اور داخلی خصائص و میلانات کا بھی کھوج لگاتا ہے وہ ہر سنی سنائی بات کو اپنی تصانیف میں جگہ دینے کا قائل نہیں۔ وہ روایات کو اصول درایت پر پرکھتا ہے اور عدل کو کسی مقام پر بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتا آزاد لکھتے ہیں :

"ان الاخبار اذا اعتمد فیھا علی مجرد النقل ولم تحکم اصول العادہ و قواعد السیاسۃ و طبیعۃ العمران والا حول فی اجتماع الا نسانی و لا قیس الغائب منھا با لشاھد و الحاضر بالذاھب منھا لم یو من فیما من العثور"۔(۱۶)

مغرب اپنے سوانحی ادب میں "ہمہ را بہ نیکی یاد کردن" کے اصول پر کاربند رہا ہے چنانچہ جیمز کلفورڈ لکھتا ہے :

"سیر الاولیاء سے مراد یہ ہے کہ مقدسین کے سوانح حیات ایسے محیر العقول واقعات و افسانوں پر مشتمل ہوں کہ وہ دوسرے انسانوں سے اونچے دکھائی دیں"۔(۱۷)

لیکن عہد حاضر میں یہ نظریہ تبدیل ہو گیا ہے چنانچہ بقول سید عبداللہ :

"فن سوانح نگاری کے جدید نقادوں میں ایڈمند گوس، لٹن سٹریچی، اندرے مورد، ہیرلڈ نکلسن وغیرہ شہرت رکھتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نے ایک اچھی بیوگرافی کے لیے خلوص و صداقت کو بنیادی اہمیت دی ہے۔ بیوگرافی کی ہیئت اور اس کے مقصد کے باب میں ہر ایک حالات اپنے میں ہی لیکن واقعہ کی صداقت پر سب یکساں زور دیتے ہیں"۔(۱۸)

بنی عباس کے عہد حکومت میں جب سوانحی ادب پر سیاسی تاریخ اثرانداز ہوئی تو یہ فن

انشاپردازی، لفاظی اور اخفائے حق کا ذریعہ بن گیا۔ تذکرہ نگاروں نے بزرگوں کی حیات اور کلام کے کمزور پہلوؤں کو دکھانے میں بہت احتیاط سے کام لیا۔ ان کے نزدیک انسان مرکب ہی خطاو نسیان سے ہے اس لیے کمزور پہلو کو نمایاں کرنا تحصیل حاصل ہے ان کے نزدیک تذکرہ نویسی کا مقصد صرف یہ رہ گیا کہ کسی فرد بشر نے انسانی شرف و کمال میں کیا درجہ حاصل کیا ہے؟ وہ سمجھتے تھے کہ سونحی ادب کو پہلے سیرت ہونا چاہیے اور پھر کتاب نقد۔

بر صغیر پاک و ہند کا اپنے جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے ان ملکوں سے براہ راست رابطہ نہیں تھا۔ جہاں عربی بولی جاتی تھی اس لیے ان لوگوں کو عربوں سے استفادہ کی وہ سہولت میسر نہ آسکی جو ایران، ماوراء النہر اور شمالی افریقہ کے ممالک کو حاصل تھی۔ کچھ یہاں 9 سو سال تک ایسے حکمران برسر اقتدار رہے جن کی زبان فارسی تھی لہٰذا ان لوگوں نے عربی کی بجائے فارسی کی طرف زیادہ توجہ دی اور اکثر دینی کتب کے فارسی تراجم کرنے میں مصروف رہے۔ آزاد نے بھی سوانحی ادب میں 6 کتابیں تو فارسی زبان میں تحریر کیں اور صرف ایک کتاب عربی میں تحریر کی، اس کا بھی ایک مختصر سا حصہ تراجم کے لیے وقف کیا ہے۔ باقی میں محسنات کلام وغیرہ سے بحث کی ہے پھر آزاد کے عربی انداز تحریر پر بھی بعض لوگ معترض ہیں۔

آزاد کے علاوہ بر صغیر پاک و ہند میں عربی سوانحی ادب میں کچھ اور کتابیں بھی ملتی ہیں جن کا ذکر زبیر احمد نے اپنی کتاب "عربی ادب میں پاک و ہند کا حصہ" میں کیا ہے لیکن ایک تو یہ کتابیں صرف پاک و ہند تک محدود نہ تھیں دوسرے ان میں بعض تو صرف ایک فرقہ کے علماء کے لیے وقف ہیں اور دوسری وفیات کا خلاصہ ہے اس اعتبار سے غالباً" سبحة المرجان في آثار هندوستان "وہ واحد کتاب ہے جو صرف پاک و ہند کے علماء کے لیے وقف ہے اور اسے ایک بہترین ماخذ کی حیثیت حاصل ہے"۔

سبحة المرجان (۱۹) اس کتاب کو آزاد نے چار ابواب میں تقسیم کیا ہے اور اس کی تالیف کے چار مقاصد بیان کیے ہیں۔

۱۔ تفاسیر اور احادیث سے وہ روایات جمع کر دی جائیں جن میں بر صغیر پاک و ہند کا ذکر ہے۔

۲۔ دوسرے ہندوستان کے ان مشاہیر علماء کے حالات قلم بند کیے ہیں جن کی تصانیف

سے ان کا ذکر خیر باقی ہے یا چند شعر ان کی یادگار ہیں۔

۳۔ جس طرح عربی زبان میں فن بدیع مدون ہے اسی طرح اہل ہند نے بھی اپنی زبان میں یہ فن مدون کیا ہے۔ ان کے اس فن سے اہل عرب کو آگاہ کیا جائے۔یہ حصہ پانچ مقالوں پر مشتمل ہے۔

ان کے پہلے مقالہ میں ان صنائع وبدائع کا ذکر ہے جنہیں مصنف نے ہندی سے عربی زبان میں نقل کیا ہے۔

دوسرے مقالے میں ان محسنات کلام کا بیان ہے جن کا مولف نے اخراج کیا ہے۔

تیسرے مقالہ میں ان محسنات کا ذکر ہے جس کے موجد امیر خسرو بلودی ہیں۔

چوتھے مقالے میں وہ دونوع بیان کیے ہیں جو اہل عرب سے مختص ہیں۔

پانچویں مقالے میں اپنا قصیدہ بدیعہ درج کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس تحریر کے وقت ادباء عرب کے سات آٹھ بدیعہ قصائد پیش نظر رہے ہیں۔اپنے اس قصیدہ پر انہیں فخر ہے چنانچہ لکھتے ہیں :

"هولاء الجماعة كلهم عرب العرباء ، و أئمة أجلا و اذا سلكت منهج تقليد هم و المهند بتابيد هم و ربما يفعل الضعيف فعل الاقوياء والنسيم العليل يفرح الاصحاء"۔

چوتھی فصل میں معشوقات اور عشاق کا تذکرہ ہے اس میں بھی پانچ مقالات ہیں۔

۱۔ مقالہ اول : غزلاں یعنی معشوقات کے ذکر میں۔

۲۔ مقالہ دوم :اقسام غزلاں یعنی معشوقات کی اقسام۔

۳۔ مقالہ سوم : میں قصیدہ غزلانیہ درج ہے۔

۴۔ مقالہ چہارم : میں اقسام عشاق مذکور ہیں۔

۵۔ مقالہ پنجم : میں قصیدہ ہیمانیہ درج ہے۔

تیسری اور چوتھی فصل مصنف کی جولانی طبع کا مرکز ہیں۔ مستند ادبا اور شعراء العرب کے کلام سے بطور استشہاد اشعار پیش کیے ہیں اور پھر ہر جگہ استشہاد کے لیے اپنے عربی اشعار لکھے ہیں اور اپنی

زباندانی اور شعر و شاعری کا سکہ جمایا ہے یہ دونوں فصلیں رنگین طبع ادباء کے لیے بہار گلزار ہیں۔ مصنف نے سنہ تالیف ۱۱۷۷ء بتایا ہے۔

پہلا باب در حقیقت آزاد کی ایک الگ تصنیف ہے جس کا نام "شمامة العنبر فی ماورد فی الهند من سید البشر" ہے بعد میں آزاد نے اسے اس کتاب میں شامل کر دیا۔

پہلا باب یعنی شمامۃ العنبر ۲۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۱۷۷ء میں جب آزاد نے اپنی کتاب "سبحة المرجان" مرتب کی تو اس رسالہ کو اس کتاب کی پہلی فصل کے طور پر شامل کر دیا۔ ابتدا میں حمد و صلوۃ کے بعد لکھتے ہیں :

"وفق الله تعالیٰ بتالیفها عبده المتوکل المتوسل الیه الفقیر غلام علی الحسینی نسباً والواسطی اصلاً والبکرامی و طناً عامله الله بلطفه سراً و علا نیاً جمع فیها ما وجد من ذکر الهند فی التفاسیر العظیمة والاحادیث الکریمة و سمها شمامة العنبر فیما ورد فی الهند من سید البشر"۔(۲۰)

اس کے بعد ان مشہور روایات کا ذکر کیا ہے جن کے مطابق حضرت آدم جب جنت سے نکالے گئے تو انہیں لنکا میں اتارا گیا حضر حوا کو جدہ میں ابلیس کو عراق اور ابلہ کے مقام پر سانپ کو اصفہان میں اور مور کو کابل میں اس کے بعد لکھتے ہیں کہ آدم ہندوستان میں ایک سو سال تک مقیم رہے اور اپنی غلطی پر روتے رہے۔

اس قسم کی کئی بے سر و پا روایتیں ہیں جو انہوں نے در منثور سے نقل کی ہیں در منثور کے حوالے سے ایک اور حدیث نقل کرتے ہیں۔(۲۱)

جہاں حضرت آدم علیہ السلام کے دونوں قدم پڑے وہ جگہ آبادیاں دریا اور شہر بن گئے اور دونوں قدموں کے درمیان جنگل اور بیابان پیدا ہو گئے۔

یہ رسالہ اس قسم کی روایات سے پر ہے ان روایات کا صحیح ہونا محل نظر ہے۔ یہاں اس امر کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ سلسلہ روایت یعنی اسناد کی جانچ پڑتال کے وعد متن حدیث یعنی حدیث

کے مضمون کو جانچنا بھی ضروری ہے ہو سکتا ہے کہ اس میں کوئی علت پائی جاتی ہو جو اسے درجہ اعتبار سے ساقط کر دے۔ ان کے متعلق علماء کے حکم کو نقد تحلیلی کہا جاتا ہے اس قسم کی احادیث کے متعلق مستقل کتابیں موجود ہیں جس میں سب سے مشہور امام طحاوی کی مشکل الاثار ہے۔ علامہ رشید لکھتے ہیں :

"ثم ان العلماء الحديث من وراء نقد اسانيد الاخبار والاثار نقد اخر لمتونها من نواحی معانيها ولغتها وحكم العقل والشرع فيها تعارضها مع غيرها و يشاركهم فی هذا النوع من النقد رجال الفلسفة والادب و التاريخ و يسمونه فی عصر نا النقد التحليلی ومن ثم استشكلوا كثيرا من الحديث حتى صحيح الاسانيد تكلموا عليها فی شروحها و صنف بعضهم فی كتباً خاصة اشهر ها مشكل الآثار للطحاوی"۔ (۲۲)

تابعین کے زمانے میں جب اہل کتاب کی ایک کثیر تعداد اسلام میں داخل ہو گئی تو ان کے ذریعہ اسی قسم کی روایات اسلام میں داخل ہو گئیں اور انہیں اسرائیلیات کا نام دیا گیا۔ مفسرین نے ان روایات کو اپنی کتابوں میں نقل کرتے وقت ان شرائط کو ملحوظ نہیں رکھا جو نقد حدیث کے لیے ان کے ہاں متداول تھیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کتب تفاسیر و حدیث میں اس قسم کی روایات درج ہوتی چلی گئیں اس لیے تنہا آزاد کو ان روایات کے لیے ذمہ دار قرار دینا درست نہ ہو گا۔

## تنقید و تبصرہ بر فصل ثانی

دوسری فصل میں اصحاب تراجم کی تعداد ۴۵ ہے۔ ان میں سے تین ایسے ہیں جن کا ذکر ضمناً اور بالتبع ہوا ہے۔ ان میں سے ایک تو ابو حفص ربیع بصری ہیں جو سندھ میں فوت ہوئے۔ دوسرے سید علی بن سید احمد شیرازی ہیں چونکہ سید عبدالجلیل کے تذکرہ میں ان کا ذکر آگیا تھا اس لیے ان کا حال قلمبند کر دیا ہے۔ اور اس لیے بھی ان کا حال کسی کتاب میں موجود نہ تھا۔ تیسرے مولانا شیخ عبداللہ بن شیخ سالم البصری المکی ہیں۔

یہ فصل مطبوعہ نسخہ کے ۱۰۰ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے آغاز فصل میں کشف الظنون کی عبارت نقل کر کے یہ بتایا ہے کہ علوم شرعیہ کے مولفین و مصنفین کے عجمی ہونے کی وجہ کیا ہے

پھر اصحاب تراجم میں سب سے پہلے ابو حفص ربیع کا ذکر کیا ہے جو بعض کے نزدیک سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے کتاب تالیف کی۔ یہ بزرگ تبع تابعین سے ہیں اور چونکہ سندھ میں فوت ہوئے اس نسبت سے تیمناً ان کا ذکر کر دیا ہے۔

مولانا مسعود کے حال میں لکھتے ہیں کہ عربی، فارسی اور ہندی تینوں زبانوں میں صاحب دیوان تھے۔ میرا اگرچہ ہندی دیوان نہیں لیکن میں اس زبان کے دقائق سے بخوبی واقف اور اس میں مہارت رکھتا ہوں پھر وطواط کی حدائق السحر سے ان کے چند عربی اشعار نقل کر کے ان کے بعض الفاظ کی تشریح بھی کی ہے۔

مولانا حسن صغانی لاہوری کے حالات میں لکھتے ہیں کہ وہ جامع العلوم تھے اور فقہائے حنفیہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ان کی تصانیف میں مشارق الانوار کا بھی ذکر کیا ہے جو ان کی مشہور تصنیف ہے۔(۲۳)

مولانا شمس الدین یحیٰ اودی کے حال میں لکھتے ہیں کہ سلطان المشائخ حضرت نظام الدین کے مرید تھے۔ پھر یہ بھی بتایا گیا کہ مولانا جامی نے نفحات الانس میں حضرت نظام الدین کا ذکر کیا ہے۔ مولانا شیخ حمید الدین دہلوی کے حال میں ان کی شرح ہدایہ کا ذکر کر کے صاحب کشف الظنون کا یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ ہدایہ کی ایک نفیس شرح ہے۔(۲۴)

قاضی عبدالمقتدر کے حال میں ان کے قصیدہ لامیۃ کے اکثر اشعار نقل کر کے بعض الفاظ کی تشریح بھی کی ہے۔ اس کے بعد لکھتے ہیں کہ مقتضائے مقام یہ ہے کہ میں اپنا وہ قصیدہ لامیۃ بھی درج کر دوں جو لامیہ ہند کے نام سے مشہور ہے۔ پھر اکاون اشعار کا اپنا طویل قصیدہ ضروری تشریحات کیساتھ نقل کر دیا ہے گویا اپنی عربی شاعری کا سکہ بٹھایا ہے۔

مولانا معین الدین عمرانی دہلوی کے متعلق لکھا ہے کہ سلطان محمد بن تغلق شاہ نے انہیں گرانقدر نفیس تحائف دے کر قاضی عضد الدین ایجی کی خدمت میں بھیجا تھا اور انہیں ہندوستان میں آنے کی استدعا کی لیکن سلطان ابو اسحاق نے انہیں روک لیا۔

مولانا احمد تھانیسری کے متعلق لکھا ہے کہ امیر تیمور نے ان کی علمی شہرت سن کر دہلی میں

بلایااور اپنی مصاحبت کے لیے منتخب کر لیا تھالیکن جب امیر تیمور نے روم پر لشکر کشی کی تو مولانااس کے ہمراہ نہیں گئے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ امیر تیمور نے ۸۰۱ ھ میں ہندوستان کو فتح کیا تو ایک شاعر نے فتح قریب سے تاریخ نکالی اور جب روم کو فتح کیا توالم غلبت الروم (۲۵) سے تاریخ نکالی۔ اس کے بعد ان کے قصیدہ دالیہ کے چند اشعار نقل کیے ہیں۔

قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی تصانیف میں الحواشی علے الکافیہ کاذکر کیا ہے مگر نام نہیں بتایا۔ (۲٦)

مولاناالشیخ علی المہائمی کی تصانیف میں ان کے رسالہ کاذکر کیا ہے جس میں انہوں نے الم سے للمتقین تک کی نحوی تراکیب کی مختلف صورتیں بیان کی ہیں۔ ان تراکیب کی تعداد بتانے میں تو مضائقہ نہ تھا مگر اس رسالہ کے کئی اوراق بھی نقل کر دیے ہیں۔

مولانا شیخ سعد الدین خیر آبادی کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ قرآن مجید کی ہر لوح ایک ہزار مرتبہ پڑھا کرتے۔ تمام قرآن مجید اسی طرح حفظ کیا۔

مولانا شیخ علے المتقی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ بتایا ہے کہ انہوں نے جلال الدین سیوطی کی جمع الجوامع کو فقہی ابواب پر مرتب کر دیا اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ابن حجر مکی صاحب صواعق محرقہ ان کے استاد تھے۔ شیخ محمد طاہر پٹنی کے حال میں ان کی شہادت کا واقعہ ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ انہیں سید محمد جونپوری کے مریدوں نے شہید کیا تھا کیونکہ وہ ان کی بدعات کی شدومد سے تردید کیا کرتے تھے۔ سید محمد نے مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔

مولانا شیخ صبغة الله کے متعلق بتایا ہے کہ انہوں نے جواہر خمسہ کو عربی میں منتقل کیا تھا۔

مولاناالشیخ احمد فاروقی سرہندی کے حالات میں ان کے مکتوبات کاذکر کر کے ان کا وہ مکتوب درج کیا ہے جس میں انہوں نے اپنے روحانی مدارج کی تفصیل بتائی ہے۔ جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنا روحانی مرتبہ حضرت صدیق اکبرؓ سے بھی بالا بتایا ہے۔ پھر اس پر علماء کا اعتراض اور اس کا جواب نقل کیا ہے اور حضرت مجدد کے مکتوبات سے اس کی توضیح و تشریح پیش کی ہے اور ان تمام فارسی

عبارتوں کو عربی میں منتقل کر دیا ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی مشہور تصانیف کا نام نہیں بتایا صرف اتنا لکھ دیا کہ ان کی تصانیف کی تعداد ایک سو ہے۔

ملا محمود جونپوری صاحب شمس بازغہ کی علوم حکمیہ میں ان کی برتری ظاہر کرنے کے لیے وہ سارا مقالہ نقل کر دیا ہے جس میں انہوں نے میر باقر استر آبادی پر مسألہ حدوث دہری میں ان کے نظریہ پر اعتراضات کیے ہیں۔ علاوہ ازیں ان کی کتاب الفوائد سے جو علم معانی سے متعلق ہے الوصل بین الجملتین کا مضمون نقل کر دیا ہے۔

میر زاہد ہروی کے حال میں ان کے اس حاشیہ کے کئی صفحات نقل کر دیے ہیں جو انہوں نے مولانا قطب الدین رازی کے رسالہ تصور و تصدیق پر لکھا ہے۔

ملا قطب الدین شہید کے واقعہ شہادت کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ یہ عثمانیوں اور انصاریوں کی باہمی عداوت و آویزش سے ہوئی۔

مولانا قطب الدین شمس آبادی کے متعلق لکھتے ہیں کہ ان کی ساری عمر فقر و فاقہ میں گزری مگر کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا اس کے باوجود ہمیشہ درس و تدریس میں مشغول رہے۔

حافظ امان اللہ بنارسی کا حال میں بنارس کے متعلق ہندوؤں کا یہ عقیدہ درج کیا ہے کہ زمین دس حصوں میں منقسم ہے اور ان میں سے ایک حصہ بنارس ہے اور یہ حصہ زمین سے علیحدہ ہے۔ اور درجے میں زمین کے باقی نو حصوں کے برابر ہے اور اللہ نے اسے نیزے کے پھل پر رکھا ہوا ہے جس کی صلیب کی طرح تین شاخیں ہیں اور یہ نیزہ مہادیو کا حق ہے جو ان کے نزدیک نوع انسان کا پہلا فرد ہے۔

قاضی محب اللہ بہاری کا ذکر کرتے ہوئے ان کی کتاب سلم العلوم سے لزومیتین کے انتاج کا مسألہ نقل کر دیا ہے۔

مولانا شیخ احمد معروف بہ ملا جیون کے متعلق لکھتے ہیں کہ ان کا حافظہ اس قدر قوی تھا کہ کتب درسیہ کے ورق کے ورق ازبر پڑھ دیتے تھے۔

اپنے نانا اور استاد عبدالجلیل بلگرامی کی پرزور الفاظ میں تعریف کی ہے اور قرآن پاک کی آیات

سے ان کی تاریخ وفات نکالی ہے اور ان کی مدح میں ایک قصیدہ بھی درج کیا ہے۔ ان کے فرزند سید محمد کی مدح میں بھی ایک قصیدہ تحریر کیا ہے اور لکھا ہے کہ سبحۃ المرجان کی تکمیل سے پہلے ہی ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ اپنے استاد سید محمد طفیل بلگرامی کے متعلق لکھا ہے کہ تمام درسی کتب کی تعلیم میں انہی سے حاصل کی تھی ان کے مرثیہ میں جو قصیدہ کہا وہ بھی درج کیا ہے۔

شیخ محمد حیات سندھی کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ حدیث میں میرے استاد تھے۔ پھر رحلہ شیخی سے ان کی تاریخ وفات نکالی ہے اور اس ضمن میں یہ بحث چھیڑ دی ہے کہ جو (ت) بصورت (ہ) لکھی جاتی ہے حساب جمل کے لحاظ سے اس کی عددی قیمت کیا ہے۔ یعنی اسے (ت) شمار کیا جائے گا یا (ہ)۔

مولانا شیخ عبداللہ شیخ سالم البصری المکی کے حال میں لکھا ہے کہ انہوں نے دو دفعہ حرم مکہ میں صحیح بخاری کا درس دیا تھا۔ پھر ۱۰۳۶ھ میں موسلا دھار بارش سے خانہ کعبہ کے جو حصے مسمار ہو گئے تھا ان کا حال لکھا ہے اور اس واقعہ ہائلہ کے متعلق جو تاریخی اشعار کہے گئے وہ بھی درج کیے ہیں۔

مولانا سید محمد یوسف کے حال میں توحید شہودی کے متعلق ان کی کتاب کا ذکر کیا ہے اور اس کے سن تالیف میں اپنے تاریخی اشعار تحریر کیے ہیں۔

سید قمر الدین الحسنی اور نگا آبادی کے ہم عصر اور دوست تھے ان کے حالات کو بہت طول دیا ہے۔ وہ حج کے لیے گئے ہیں تو ان کے حالات سفر قلمبند کر دیئے ہیں پھر ان کی تالیف مظہر النور کے کئی صفحات نقل کر دیے ہیں اور اس کی سن تالیف میں کئی اشعار بھی درج کیے ہیں۔ ان کے بیٹے میر نور الہدیٰ نے اپنے باپ کی تالیف کی جو شرح لکھی ہے اس کے بھی کئی صفحے نقل کیے ہیں۔

آزاد نے اپنے حال میں پہلے تو اپنے اساتذہ کا ذکر کیا ہے۔ پھر حج کے لیے چپکے سے اپنی روانگی کا حال لکھا ہے اور اپنی تالیفات کے ضمن میں اپنے عربی دیوانوں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ میرے دیوانوں میں عربی اشعار کی تعداد تین ہزار ہے اور میں نے وہ دیوان مدینہ منورہ میں بعض فضلا کی خدمت میں اس لیے ارسال کیے کہ انہیں آنحضرتؐ کے روضہ مقدسہ کے اندر رکھ دیا جائے۔

قاضی محب اللہ بہاری کی سلم العلوم سے لزومیتین کے انتاج کے مسئلہ نقل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میر زاہد مہروی نے علامہ قطب الدین رازی کے رسالہ تصور و تصدیق پر جو حاشیہ لکھا ہے بلا ضرورت اس کے کئی صفحات نقل کر دیئے ہیں۔ سید قمر الدین کی کتاب مظہر النور سے وجود کی فلسفی بحث کر دی ہے اور پھر ان کے بیٹے نور الہدیٰ نے اپنے والد کی تصنیف کی جو شرح کی ہے اس کے بھی کئی صفحے نقل کر دیئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے دقیق علمی مسائل نقل کر کے آزاد مرحوم شاید یہ بتانا چاہتے ہیں کہ وہ اس قسم کے دقیق مباحث سے بخوبی آگاہ ہیں۔

مذکورہ بالا غیر ضروری امور کے علاوہ یہ فصل بہت سی مفید معلومات پر مشتمل ہے اور قابل قدر تصنیف ہے یہ عجیب بات ہے کہ آزاد مرحوم نے مولانا عبدالنبی احمد نگری کا نام نہیں لیا جو ان کے ہم عصر اور دوست تھے کیونکہ انہوں نے دستور العلماء میں ان کا ذکر کیا ہے۔ علامہ زبیدی صاحب تاج العروس کا ذکر نہیں کیا۔ اس کتاب کو سوانحی ادب کی بجائے اگر قاموس الاعلام کا نام دیا جائے تو زیادہ موزوں ہوگا۔ شعروں کا انتخاب زیادہ تر آدمی کی ذاتی رجحان طبع کے زیر اثر ہوتا ہے۔ اس لیے ممکن ہے کہ قاری کو اس کا انتخاب پسند نہ آئے ابوالکلام لکھتے ہیں کہ "آزاد کا شعری ذوق عمدہ نہ تھا"۔

خود ستائی نے اس کتاب کو نقد کے درجہ سے گرا دیا ہے۔ لیکن کئی اعتبار سے یہ کتاب قیمتی ماخذ ہے۔ آزاد نے ناموں کے تلفظ کو ضبط کیا ہے، جب کسی کے حالات لکھتے ہیں تو پہلی دو سطریں مسجع عبارت میں لکھتے ہیں کئی مقالات پر آزاد سے تاریخی اعتبار سے کچھ غلطیاں سرزد ہوئی ہیں لیکن اس مختصر مضمون میں ان کو زیر بحث نہیں لایا جا سکتا۔

# حواشی وحوالہ جات

1۔ ڈاکٹر زبیر احمد : عربی ادبیات میں پاک وھند کا حصہ (اردو ترجمہ) ۱۳

2۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۲ ص ۹۲۲

3۔ آزاد بلگرامی نے پورب کی جو وضاحت کی ہے اس کے مطابق یہ آودھ ،الہ آباد اور عظیم آباد کے صوبوں پر مشتمل تھا(سبحة المرجان ص ۵۳۰ مطبوعه بمبئی ۱۳۰۳ھ)

4۔ قاضی عبدالمقتدر (شریحی ، کندی دہلوی جن کا قصیدہ "لامیۃ الھند" مشہور زمانہ ہے اس قصیدہ کے کچھ اشعارسبحة المرجان میں درج ہیں ۔ (سبحة المرجان ص ۱۸۴ مطبوعه بمبئی ۱۳۰۳ھ)

5۔ بلگرام کا قدیم نام اس کے راجا سری رام کے نام پر سری نگر تھا۔ یہاں لوگ ایک بیل کی پوجا کرتے تھے جو وہاں کے جوگیوں نے کشمیر سے لا کر یہاں نصب کر دیا تھا۔ مسلمانوں نے جب اس کو فتح کیا تو اس بیل کو آبادی سے دور منتقل کر دیا اور اس کا نام بیل گرام تجویز ہوا جو بعد میں بلگرام ہو گیا۔ غلام حسین ثمین نے اس کی دوسری وجہ بیان کی ہے ۔انہوں نے اپنی تصنیف "شرائف عثمانی" میں آزاد کے اس دعویٰ کو تسلیم نہیں کیا۔ آزاد کے زمانے میں تو یہ مسئلہ ایک قلمی مناظرے کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ ثمین کا خیال ہے کہ آزاد نے یہ مفروضہ خاندانی عصبیت کی بناء پر پیش کیا ہے لیکن ثمین کا یہ اعتراض بے محل ہے آزاد نے ہمیشہ اپنی درویشانہ زندگی کو ہی اجاگر کیا ہے آزاد نے اپنی تصانیف میں جہاں جہاں دیگر بلگرامیوں کا ذکر کیا ہے بڑی عزت و احترام کے ساتھ ان کا نام لیا ہے چنانچہ ید بیضا ،مآثر الکرام اور مرد آزاد اسکے شاہد ہیں ۔ اگر عام طور پر محمد صغری اور خواجہ عماد الدین کے متعلق فاتح بلگرام ہونا مشہور تھا تو اس کی کچھ اصل بھی ہوگی ۔ مور خین کے نزدیک زیادہ قرین قیاس یہ روایت ہے کہ ۱۲۱۷ء میں التمش کے عہد حکومت میں شیخ محمد فقیہ عراقی نے نے اس شہر پر حملہ کیا سید محمد صغری ، فرشوری شیوخ اور ترکمان جوان ان کی معیت میں تھے۔اس بارے میں بھی

مورخین میں اختلاف ہے کہ مسلمان بلگرام میں کب آئے؟ کیوں آئے؟ اور اس کا فاتح اول کون تھا؟ آزاد، ماثر الکرام میں لکھتے ہیں: "اول کسے از کابر طریقت بہ مقدم گرامی بلگرام راشائستہ اکرام ساخت خواجہ عماد الدین و سید محمد صغری ہر دو مرید خواجہ قطب الدین دہلوی و جناب معین الدین چشتی اجمیری قدس اسرار ھم بودند" مقبول احمد صمدنی نے معارف فروری ۱۹۶۲ء میں ایک مقالہ تحریر کیا جس میں انہوں نے آزاد کو بلگرامی کی بجائے صمدنی ظاہر کیا ہے۔

6. A. Gazatteer of Hardoi (Agra & Oudh by H. R. Nerill vol XVi P. 176.

7. Cambridge History of India Vol. 4

8۔ سبحة المرجان صفحہ ۱۱۸۔۱۲۳

9۔ سوق عکاظ: جاہلیت کا ایک عظیم بازار یعنی میلہ جس میں عرب اکٹھے ہوتے۔ طائف اور نخلہ کے درمیان ایک وادی کا نام ہے جہاں ذوالقعدہ کی 20 تاریخ تک سالانہ میلہ منعقد ہوتا تھا۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج ۱۳، ص ۴۲۷

10۔ شیخ احمد امین: المعلقات العشر و اخبار شعرائها ص ۸۱ مطبوعه المكتبه التجارية مصر

11۔ حومانة الدراج: ماء بنجد على طريق البصره الى مكه

12۔ المتثلم: موضع قريب منه

13۔ منشم ایک عورت کا نام ہے جس سے لوگ اپنے مردوں کے لیے خوشبو خریدا کرتے تھے۔ قيل منشم اسم لشده الحرب: فواد افرام البستانی۔ الروائع ص ۲۸۰

14۔ سید عبداللہ، فن سیرت نگاری پر ایک نظر، فکر و نظر، اپریل ۱۹۷۶ء

15۔ شبلی نعمانی، سیرت النبی، جلد اول ۲۸

16۔ آزاد ابوالکلام، الہلال مئی ۱۹۱۳ء

17۔ سید عبداللہ، فن سیرت نگاری پر ایک نظر، مجلّہ فکر و نظر (اسلام آباد) اپریل ۱۹۷۶ء

18۔ سید عبداللہ، سیرت نگاری پر ایک نظر، مجلّہ فکر و نظر (اسلام آباد) اپریل ۱۹۷۶ء

19۔ سبحة المرجان: قلمی نسخوں کے لیے دیکھیے فہرست کتب خانہ آصفیہ ج ۳

The Catalogue of Oriental Library Ban: ۸۵۹،۸۵۷،۹۵۳،۲۵۹ص

kiPur; vol 8 P.123-124

India office Library P. No. 655 of the Catalogue

یہ ۱۳۰۳ھ میں پہلی بار طبع ہوئی اور غالباً یہ اس کی طباعت کا پہلا اور آخری نسخہ ہے۔

20۔ شمامۃ العنبر ص ۲

21۔ الدر المنثور فی التفسیر بالمأثور لحافظ جلال الدین السیوطی، جلد اول، ۵۵

22۔ رشید رضا، تفسیر المنار ج ۲ : ۱۰۸

23۔ مولانا حسن صغانی نے علامہ زمخشری کی المفصل کے ابیات کی شرح لکھی ہے لیکن آزاد نے اس کا ذکر نہیں کیا۔

24۔ لیکن ابن کمال پاشا کہتے ہیں کہ اس میں تفصیل کی جگہ اجمال سے کام لیا ہے اس لیے علماء میں مقبول نہیں۔ صاحب کشف الظنون ابن کمال پاشا کا یہ قول نقل کر کے لکھتے ہیں : ابن کمال پاشا اگرچہ فاضل اجل اور علامہ ہیں لیکن وہ اپنی اکثر تصانیف میں تحقیق کی بجائے مجادلانہ رنگ اختیار کر لیتے ہیں بالخصوص ہدایہ کی شرح میں یہی روش اختیار کی ہے اور انتہا یہ ہے کہ بڑے علماء اور متکلمین کو عوام کی صف میں لا کھڑا کر دیا ہے۔

25۔ القرآن ۸۴ : ۱

26۔ عربی ادبیات میں بر صغیر پاک و ہند کا حصہ، ڈاکٹر زبیر احمد، ص ۳۹۷ (شہاب الدین احمد بن عمر دولت آبادی، م ۸۴۹ھ)

اس کا نام غایۃ التحقیق ہے۔ ڈاکٹر زبیر احمد اس کی تحقیق نہ کرتے تھے حالانکہ یہ قاضی دولت آبادی ہی کی تصنیف ہے جس کا ذکر آزاد بلگرامی نے کیا ہے۔